بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان مسائل کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے بھی رہتے ہیں، لیکن عام طور پر جو بحثیں پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے، کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کی اہمیت ہے، اور کس طرح وہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل کیا اور رکھا جائے۔ وہ اس کی توجہ ان سے ہٹا کر ہنگامی معاملات کی طرف پھیرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے اب تک وہی نشے پلائے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے پلا رہے تھے۔ وہ اسے تھپکیاں دے دے کر مطمئن کر رہے ہیں کہ یہ مسائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لئے کچھ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ، اور خواہ کسی پارٹی کی اغراض کے لئے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہرحال قوم کی خیرخواہی کا ان میں شائبہ تک نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے مسائل رکھ دئے جائیں جن سے اس کو عہدہ برآ ہونا ہے، پھر اسے یہ سوچنے کی دعوت دی جائے کہ آیا وہ اپنی موجودہ حالت

میں ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو الحمد للہ، اور نہیں ہے تو سے لامحالہ اپنے اندر تبدیلی کرنی ہوگی اور غور کرنا پڑیگا کہ وہ تبدیلی کس نوعیت کی ہو۔

ہمارے لئے اس وقت سب سے زیادہ نازک اور سب سے بڑھ کر دلخراش مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی، یعنی ہماری قوم کا پورا نصف حصہ۔ تقسیم کے بعد ان میں سے کئی لاکھ فنا کے گھاٹ اتار دئے گئے، ایک بڑی تعداد جبراً غیر مسلم بنالی گئی، ساٹھ ستر لاکھ پاکستان میں دھکیل دئے گئے اور دس پندرہ لاکھ کو حیدرآباد میں پناہ لینی پڑی۔ اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔ یہ باقی ماندہ مسلمان آج انڈین یونین میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روس کے ماتحت مفتوح جرمنوں اور امریکہ کے ماتحت شکست خوردہ جاپانیوں کی حیثیت ہے۔ دس سال کی تلخ و تیز قومی جنگ کے بعد اب وہ بالکل بے بسی کے ساتھ اپنے سابق حریفوں کے قبضے میں ہیں۔ انہیں "پاکستان زندہ باد" کی وہ قیمت دینی پڑ رہی ہے جو ان کے شہری حقوق ہی کو نہیں، انسانی حقوق تک کو کھا گئی ہے۔ وہ سب "غدار" اور سب "جاسوس" ہیں۔ ہر ایک کی وفاداری مشتبہ ہے۔ ہر ایک کے لئے خانہ تلاشی اور گرفتاری مقدر ہے الا یہ کہ کسی کی باری آنے میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پوری قوم اصل میں یرغمال بن چکی ہے۔ اس کے لئے عزت کی زندگی کا دروازہ بند ہے اور صرف تین راستے کھلے ہوئے ہیں: یا تو برضا و رغبت مرتد ہو جائے، یا اچھوتوں سے بدتر حالت میں رہے، یا پھر خاموشی کے ساتھ ان سب تدبیروں کو برداشت کرتی چلی جائے جو اس کی امتیازی ہستی کو مٹانے اور اسے ہندو قومیت میں جذب کرنے کے لئے عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی جاری رہی تو مستقبل قریب میں مسلمان ہندوستان سے اسی طرح غائب ہو جائینگے جس طرح وہ اندلس اور صقلیہ سے غائب ہو چکے ہیں، لاقدر اللہ۔

چار کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان قوم اس وقت بالکل بے سہارا ہے۔

جس سیاست پر اب تک اس کا مدار کار تھا اس کی بساط انقلاب کے ایک ہی پلٹے نے الٹ دی۔ جس قومی تنظیم پر اس کا سارا اعتماد تھا وہ طوفان کا ایک تھپیڑا بھی نہ سہہ سکی۔ جن لیڈروں کے ہاتھ میں وہ اپنے معاملات سونپ کر مطمئن ہو بیٹھی تھی وہ اس کے لئے بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ ان کے کچھ اکابر تو خاموشی کے ساتھ اٹھ کر پاکستان چلے آئے، اور باقی اکابر و اصاغر سب دشمنوں کے آگے توبہ و استغفار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سیرت و اخلاق کے بغیر جو لوگ محض نعروں کے بل پر لیڈر بنے تھے وہ زمانے کا رُخ بدل جانے کے بعد ایک دن بھی اپنے قبلے کی سمت استوار نہ رکھ سکے۔ انقلاب کی پہلی ہی رات وہ اپنے ان سارے نظریات اور اصولوں کو طلاق مغلظ دے بیٹھے جن پر دس سال سے وہ اپنی قوم کو لڑا رہے تھے۔ دو قومی نظریہ یک لخت ان کے نزدیک باطل ہو گیا۔ یک قومی نظریے کی صداقت اچانک ان پر منکشف ہو گئی۔ ترنگے جھنڈے کی عقیدت یکایک ان کے دل میں گھر کر گئی۔ چند روز کے اندر ان مجاہدین ملت کو وطن پرستی میں ایسا شرح صدر نصیب ہوا کہ ان کے حلقے سے مخلوط ہندو مسلم شادیوں تک کی تجویزیں آنے لگیں تاکہ مسلم و ہندو کے اندر سے یہ کمبخت "من دیگرم تو دیگری" کا احساس تو کسی طرح دور ہو! اس پورے گروہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھونے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنھوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اُس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

ان سے مایوس ہو کر اس ڈوبتی ہوئی قوم نے ان تنکوں کا سہارا لینا چاہا جو پہلے سے کانگرسی دریا کی سطح پر تیر رہے تھے، مگر اب وہ بھی اس کے لئے بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اب بھی وہی رائے رکھتا ہے کہ مسلمان اپنے امتیازی وجود کو خود بھول جائیں اور ہندی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفظِ ذات کا نہیں بلکہ "آسان بمیری" کا نسخہ ہے جو مسلمان کے مزاج کو نہ پہلے راس آیا تھا اور نہ اب راس آ سکتا ہے۔ دوسرا گروہ کچھ مسلمان کے "مستقل وجود" اور کچھ اس کے "حقوق" کا بھی تصور رکھتا ہے، مگر یہ نام زبان پر آتے ہی پرانے سے پرانا کانگرسی مسلمان

بھی ہندو قوم پرستوں کی نگاہ میں بس ایک نقاب پوش لیگی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت درحقیقت ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ تقسیم نے ہمیں کاٹ ضرور دیا ہے، مگر وہ ہیں ہماری ہی قوم کا ایک حصہ، اور معمولی نہیں پورا ۱/۵ حصہ۔ ان کو ہم یوں ہی مٹنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا ہم پر سب سے بڑا حق ہے، اس لئے کہ جس پاکستان سے ہم متمتع ہو رہے ہیں اس کی اصل قیمت انہی نے ادا کی ہے۔ وہ اس لئے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ ہمارا بہترین مردم خیز حصہ وہی ہیں۔ انہیں اس بنا پر بھی نذر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ہزار سالہ تہذیب کے تمام چیدہ ثمرات، اور ہمارے تمام بڑے بڑے معاہد اور اداروں کے امانت دار وہی ہیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ آخر ہم ٹھنڈے دل سے یہ بات کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے پچھلے ایک ہزار سال میں جو محنتیں، اور جو جانفشانیاں اسلام کے پیغام کو اکناف ہند میں پھیلانے کے لئے کی ہیں ان سب پر پانی پھر جائے اور توحید کی دعوت سمٹ کر برعظیم ہند کے صرف دو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود ہو جائے۔ لہٰذا کوئی شخص بے پروائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اُن کا اپنا مسئلہ ہے۔ نہیں یہ پاکستان کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا ہندوستان کا ہے، اور فی الواقع یہ اس پوری ملت اسلامیہ کا مسئلہ ہے جو اس مصنوعی تقسیم کے باوجود اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہی ملت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان چار کروڑ مسلمانوں کو بچانے، اور ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تک چونکہ قومی حیثیت سے ہمارا مدار کار بالکل مسلم لیگ کے نظام اور اس کی قیادت پر رہا ہے اس لئے یہ سوال لازماً اسی کی طرف پھرتا ہے۔ کیا تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ نے اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کیا تھا؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت کے لئے کام کرنے کا اب کوئی موقع ہے؟ کیا پاکستانی مسلم لیگ اس بارے میں

اپنے پاس کوئی لائحہ عمل رکھتی ہے ؟ کیا پاکستان کی موجودہ حکومت اس قابل ہے کہ ہندو مسلمانوں کی قسمت پر کوئی اچھا اثر ڈال سکے یا ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کو درخشاں نہیں تو کم از کم محفوظ ہی کرنے کے لئے کچھ کر سکے ؟ اگر ان سوالات کا کوئی جواب ہے تو اسے معلوم کر کے ہم بہت خوش ہونگے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک ہمارے قومی معاملات کی سربراہ کاری موجودہ سیاست و قیادت کے ہاتھ میں ہے، اپنی ملت کے اس سب سے بڑے مسئلے کا کوئی حل ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، اور یہی سیاست و قیادت ہماری سربراہ کار رہی تو ہمیں چند سال کے اندر یہ دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ واہگہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال کی سرحدوں سے گاٹھیاواڑ کے سواحل تک کا پورا علاقہ اسلام سے خالی ہو جائے !

دوسرے مسائل پاکستان سے متعلق ہیں۔ عموماً ان سب مسائل کو لپیٹ کر صرف ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے " پاکستان کا دفاع اور استحکام " اور اس کا حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی مل کر ایک ہو جائیں اور فوجی حیثیت سے مضبوط ہوں۔ لیکن تھوڑا سا تجزیہ کرنے ہی پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ پاکستان کا دفاع و استحکام کوئی ایک سادہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اور اس کا حل بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ایک ملک جس کے اخلاق کو گھن لگا ہوا ہو محض اسلحہ اور فوجی تربیت کے بل پر کھڑا ہو سکتا ہے ؟ کیا ایک ملک جس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور باہم متصادم کرنے کے لئے بہت سے طاقت ور اسباب موجود ہوں بس " ایک ہو جاؤ " کی تسبیحیں پڑھنے سے واقعی ایک ہو سکتا ہے ؟ پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی و سادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں، ہمیں واضح طور پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الواقع پاکستان کا بقاء و تحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حل کر سکتے ہیں۔

اولین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویشناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کارفرما ہیں۔ اس بگاڑ کا زہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اُتر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نمبر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لئے اتنا خوفناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوت حیات کو کھا گیا ہے اور کھائے چلا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بداخلاقی کا جو طوفان اُٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کو بہالے گیا۔ قتل و خون، آتش زنی، اور عورتوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوئی ہوگی، لیکن لوٹ مار کی آلائش نے لاکھوں کو ملوث کر کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈھائی ہزار آبادی میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصہ لینے سے پرہیز کیا تھا، اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے بمشکل ۳۵ گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پھر ان لٹیروں میں محض جاہل عوام اور بازاری لوگ ہی شامل نہ تھے۔ بڑے بڑے شرفا اور معززین، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے، بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہائے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر، امن و انتظام کے ذمہ دار مجسٹریٹ، حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے نامور قومی کارکن، اسمبلی کے ممبر، اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دُنیا ان کو جانتی ہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب کھل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بری طرح ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہزارہا آدمی قتل و خون کے مشتاق موجود ہیں، ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بد سے بدتر جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور نیچے سے لیکر اونچے طبقوں تک کم از کم ۹۵ فیصدی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھیں حرام کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہوتا، بشرطیکہ انھیں قانون کی گرفت

سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لئے یہ کوئی وجہ تسلی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو زہر انھوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اتر گیا ہے۔ کیا مشاق مجرموں اور بے باک خائنوں کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لئے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بداخلاقیاں جو کل غیروں کی جان مال اور عصمت کے معاملے میں برتی گئی تھیں اُن کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور اپنا کوئی پائدار اثر ہماری سیرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیا یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں کے ہاتھ صاف کرنے سے رکے رہ جائینگے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گذشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہ تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوفناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو دشواریاں فطرۃً ایک نئی مملکت کو پیش آیا کرتی ہیں وہ تو ہمیں پیش آنی ہی تھیں، اور جو مصائب انگریز ہندو اور سکھ کی باہمی سازش سے ہم پر نازل ہوئے وہ بھی اپنی جگہ تھے۔ یہ سب کچھ بڑی آسانی کے ساتھ انگیز کیا جا سکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اخلاق کی خرابیوں نے ہماری مشکلات اور مصیبتوں کو جتنی کہ وہ تھیں، اصل سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔

مثال کے طور پر "مہاجرین" کے مسئلے کو لیجئے جو پاکستان بنتے ہی ایک پہاڑ کی طرح ہم پر نازل ہوا۔ بلاشبہ ایک ملک کے لئے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں کہ اس پر ساٹھ ستر لاکھ بے سروسامان آدمی یک لخت لاکر ڈال دئے جائیں۔ لیکن غور سے دیکھئے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقۃً رونما ہوئی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں نے کر دیا

ہندوؤں اور سکھوں نے جو عمارات، سامان، اموال، دکانیں، کارخانے، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے، حکومت کے عمال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا مہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دقتیں پیش آسکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں؟ مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا اور اس کا کتنا حصہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا؟ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آجائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اُسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حمام میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھینگے۔

پھر جو لوگ کل تک "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے، جن سے بڑھ کر دردِ قومی میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے "مجاہد ملت" بنے ہوئے ہیں، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئیگی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کئے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت خواریاں، یہ خیانتیں، یہ غبن، یہ قومی خرچ پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں، یہ فرائض سے غفلت، یہ ڈسپلن سے گریز، یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظامِ حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہلکاروں سے لیکر بہت سے عالی مقام حکام اور وزراء تک آلودہ ہیں، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ دوکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصہ نااہل اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لئے، نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لئے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی اُمید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامل نہ کرنا کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو سکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واگہ اور لاہور کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۳ لاکھ مسلمانوں کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے ان بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا ہے اور اس کے عزیزوں کو نمازِ جنازہ پڑھنے کے لئے اُجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو بلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں

اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچ کر آ گئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں ——— اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے علم میں آئے ہیں، اور ان شرمناک جرائم کے مرتکب صرف عام شہدے ہی نہیں تھے ——— کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو سکینگے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر ہی کے لئے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دیگا؟

تھوڑی دیر کے لئے ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو سنبھالنے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لئے کیا کر رہی ہے؟ اخلاق بنانے اور سنوارنے کا کیا سر و سامان اس کے پاس ہے؟ کیا تدابیر اس کے پیش نظر ہیں؟ کیا لائحہ عمل اس نے بنایا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا چاہیئے۔ اگر اس کے جواب میں ان نصائح کی طرف اشارہ کیا جائے جو کبھی کبھی ریڈیو اور سرکاری پریس اور تقریروں کے ذریعہ سے پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہلکاروں کو کی جاتی رہتی ہیں تو ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں کہ اس طرح کی طفل تسلیوں سے ہمیں معاف رکھا جائے۔ اس لئے کہ بداخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود قصر قیادت کے ستونوں میں شامل ہیں۔ کارفرمائی اور کارپردازی کی باگیں تو اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی بڑی اکثریت ہی کے دم قدم سے بداخلاقی کا بازار گرم ہے۔ پھر بھلا خیانت کی زبان سے امانت کا سبق، خودغرضی کی زبان سے ایثار کا وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس انسانی فطرت نے کب قبول کیا ہے کہ یہاں اس کے کارگر ہونے کی توقع کی جائے!

دوسرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی، اس کے بقاء اور اس کے استحکام کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک نبیان مرصوص بنایا جائے۔ یہ عناصر اس وقت شدت کے ساتھ مائل انتشار نظر آ رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عناصر ترکیبی ہی اگر مجتمع اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا سخت دشوار ہے۔ اس کے اجزاء وجود میں پراگندگی کا رجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ ہے، اور کون ہے جو اس کا انکار کر سکتا ہو، کہ پاکستان کے ترکیبی عناصر میں جمع و تالیف کے بجائے کچھ انتشار و پراگندگی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور کچھ قومیں ان کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بند استحکام، بلکہ عین ہماری بندش وجود ہی میں یہ ایک خطرناک رخنہ ہے جسے دور کئے بغیر ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے ان میں تین تفریقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔

پہلی تفریق مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد اس وقت ۱۰ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر حصہ سے مسلمان اکھڑ اکھڑ کر برابر پاکستان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ مشرقی ہند کے لوگوں کا رُخ مشرقی پاکستان کی طرف ہے اور باقی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی راہ لے رہے ہیں۔ یہ نیا عنصر اب ہماری آبادی کا ایک مستقل عنصر ہے اور تعداد کے لحاظ سے کوئی معمولی عنصر نہیں ہے۔ لیکن متعدد اسباب ایسے ہیں جو نئے اور پرانے عناصر کو مل کر ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ کچھ تو زبان، تہذیب، معاشرت اور عادات و خصائل کے قدرتی اختلافات ہیں جو بہرحال ایک مدت تک یگانگت میں مانع ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان پر غیر معمولی اضافہ جس چیز نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور غیر مہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور نفسانی خودغرضیاں کارفرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں عناصر کو پھاڑ رہی ہے، ان کو مخالف جتھوں کی شکل میں منظم کر رہی ہے، ان کے درمیان آویزش کی صورتیں پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خودغرض مفسدین ان کو باہم لڑا رہے ہیں۔

دوسری تفریق جغرافی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اول تو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں اور ہر جزء دوسرے جزء کے خلاف تعصب رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں، پانچ مختلف قومیں ہیں جو مصنوعی طریقہ پر ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔ ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رجحان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان گروہ اس کو شدید تر کرنے کی پیہم جد و جہد کر رہے ہیں۔

تیسری تفریق معاشی ہے۔ امیر اور غریب، زمیندار اور کاشتکار، مزدور اور سرمایہ دار، بڑی تنخواہیں پانے والے افسر اور چھوٹے اہلکار، یہ مختلف گروہ ہیں جن کو معاشی بے انصافیوں نے ایک دوسرے سے پھاڑ دیا ہے۔ ان کے درمیان اخوت اور ہمدردی کا تعلق نہیں ہے بلکہ حسد اور بغض کا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے رفیق اور حامی و ناصر نہیں ہیں بلکہ حریف اور بدمقابل ہیں۔ ان کی کشمکش بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہمارے اندر ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کا مستقل فلسفہ ہی یہ ہے کہ انہیں ملا کر ایک کر دینے کا خیال باطل ہے اور حق صرف یہ ہے کہ ان کو باہم لڑا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ مختلف تفریقیں، جو ہماری قوم اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، جن کو نشو و نما دینے کے لئے گہرے داخلی اسباب بھی موجود ہیں، اور جنہیں بھڑکانے کے لیے خارجی محرکات کی بھی کمی نہیں ہے، آخر کس طریقے سے مٹائی جا سکتی ہیں؟ طاقت کے ذریعہ سے ان کو دبا کر ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک حد تک ممکن ہے، مگر یہ چیز دلوں کو جوڑ کر وہ قلبی وحدت تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لئے ضروری ہے۔ پھٹے ہوئے دل اور کھنچے ہوئے ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی تصورات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس نے ملک کی آبادی میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی وجود کا احساس جگا دیا جو اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر معاشی اغراض کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم اُن دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ وہ مالی، صنعتی، انتظامی، دفاعی اور خارجی مسائل بھی اپنی جگہ کافی اہم ہیں جن سے ہم اس مملکت کی پیدائش کے بعد دوچار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ نہ اُن واقعی خدمات کا انکار کرنا قرینِ انصاف ہے جو اس سلسلہ میں موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے لئے اس وقت سب سے بڑے مسئلے یہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل محکِ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں صحیح طور پر حل کرنے کی اہلیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے۔